ڈاکٹر نعیمہ بی بی

ٹیچنگ اینڈ ریسرچ ایسوسی ایٹ

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

ڈاکٹر صباحت مشتاق

لیکچرر اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

مابعد جدید ناولوں میں انسانی شناخت کا قضیہ: شناختی بیانیہ کے تناظر میں

Abstract:

The theory of identity narrative is very popular in Europe and is continuously being worked on in different aspects. An important name among the thinkers presented by this theory is Dan p. McAdams who presented the identity narrative theory in his book Handbook of Identity Theory and Research. The fourth chapter of this book deals entirely with identity narrative In which he says that narrative identity is actually the process of internal and external evolution of man through which man considers himself capable of maintaining his current identity which he himself has created or his ancestors. The recognition given by is sufficient for this. The theory of identity narrative not only states that man is constantly going through the process of his identity, he wants to go to his origin, but also that man is in search of his defined identity in society. Feminism discourse is the major component of this identity narrative where women are constantly engaged in the process of identifying themselves. Around the 1980s, many thinkers began to propose the identity narrative. This narrative found its way into fiction as well as mainstream writing, and postmodern novels began to create characters who were searching for their own identity. On the one hand, there are those characters who go through the process of their family identity, on the other hand, there are those characters who want to identify their existence in the society.

This issue of humanitarian identity is also found in post-modern Urdu novels. This paper studies the process of searching for human identity in four postmodern novels.

Key Word: Dan p. McAdams, Handbook, Feminism

شناختی بیانیہ کا نظریہ یورپ میں بہت مقبول ہے جس کی مختلف جہات پر مسلسل کام ہو رہا ہے۔اس نظریے کے پیش کردہ مفکرین میں ایک اہم نام Dan p. McAdams کا ہے جنھوں نے شناختی بیانیہ تھیوری کو اپنی کتاب Handbook of Identity Theory and Research میں پیش کیا ہے۔اس کتاب کا چوتھا باب مکمل طور پر شناختی بیانیہ سے متعلق ہے جس میں وہ کہتے ہیں دراصل بیانیہ شناخت انسان کی اندرونی اور بیرونی ارتقا کا عمل ہے جس سے گزر کر انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ وہ اپنی موجودہ شناخت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے جو اس نے خود اپنے بل بوتے پر بنائی ہے یا آباواجداد کی طرف سے ملنے والی شناخت اس کے لیے کافی ہے۔اس شناخت سے وہ اپنی زندگی کی معنویت کو تشکیل دیتا ہے۔دراصل شناختی بیانیہ انسان کو باور کراتا ہے کہ وہ اصل میں کیا تھا؟اور اب اس کی زندگی کس دھارے پر جارہی ہے۔عموماً لوگ ایک خاص عمر تک پہنچنے کے بعد اپنی شناخت کے عمل میں سرگرداں ہو جاتے ہیں کہ ان کی اصل کیا ہے؟'شناختی بیانیہ کا نظریہ صرف یہ نہیں بتاتا کہ انسان اپنی شناخت کے عمل سے مسلسل گزر رہا ہے اور وہ اپنی اصل تک جانا چاہتا ہے بلکہ یہ بھی کہ انسان معاشرے میں اپنی متعین شناخت کی تلاش میں ہے فیمنزم ڈسکورس اس شناختی بیانیے کا سب سے بڑا جزو ہے جہاں عورت مسلسل اپنی شناخت کے عمل میں مصروف ہے۔1980ء کے لگ بھگ بہت سے مفکرین نے شناختی بیانیہ کو پیش کرنا شروع کیا یہ بیانیہ عام تحریروں کے ساتھ فکشن میں بھی در آیا اور مابعد جدید ناولوں میں ایسے کردار تشکیل دیے جانے لگے جنھیں اپنی شناخت کی تلاش تھی ایک طرف تو وہ کردار ہیں جو اپنی خاندانی شناخت کے عمل سے گزرتے ہیں تو دوسری طرف وہ کردار جو معاشرے میں اپنے وجود کی شناخت منوانا چاہتے ہیں۔دراصل یہ کردار معاصر عہد کے انسان کی نفسیاتی پیش کش ہیں جہاں انسان اپنے اصل کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔انسانیاتی شناخت کا یہ قضیہ مابعد جدید اردو ناولوں میں بھی ملتا ہے۔

مابعد جدید اردو ناول زندگی کی کئی جہات کا احاطہ کرتے ہیں۔ان ناولوں میں زندگی کی المناکی کو مضحکہ خیز سنجیدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔یہ مضحکہ خیزی بعض اوقات ان ناولوں کی بنت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔مابعد جدید ناول جہاں اس تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی کی عکاسی کر رہے ہیں وہیں کچھ ایسے مسائل بھی ان ناولوں میں پیش کیے

گئے ہیں۔ جن میں ایک اہم مسئلہ انسانی شناخت کا بھی ہے۔ شناخت کی تلاش مابعد جدید ناولوں کا ایک المیہ ہے۔ جس کا اظہار اردو ناولوں میں مختلف صورتوں میں سامنے آیا ہے۔

مابعد جدید ناولوں میں ایک اہم ناول مرزا اطہر بیگ کا "غلام باغ" ہے۔ غلام باغ کا موضوع وہ ارذل نسلیں ہیں جو اب اپنی شناخت کھو چکی ہیں۔ عموماً ارذل نسل کی اصطلاح ماتگر جاتی کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ان نسلوں کو معاشرے میں نہ کوئی مقام حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی کوئی عزت کی جاتی ہے۔ ایک لمبے عرصے کی محنت کے بعد یہ نسلیں کہیں نہ کہیں اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں وہ بھی اس صورت میں جب وہ اپنی اصل شناخت چھپا لیتی ہیں۔ شناخت چھپانے کا یہ عمل بعض اوقات ارادی بھی ہوتا ہے اور غیر ارادی بھی۔ مگر ہر دو صورتوں میں اس فرد کے لیے یہ اذیت ناک عمل بن جاتا ہے۔ جب ہی کوئی فرد اپنی شناخت چھپاتا ہے اس کی نسل سے کوئی نہ کوئی اس شناخت کی تلاش میں ضرور نکل کھڑا ہوتا ہے۔ پھر جب بھی ان نسلوں کی اصل شناخت ظاہر ہو جائے تو یہ نسلیں اسی مقام پر آ جاتی ہیں جہاں سے انھوں نے آغاز کیا تھا۔ کبیر جب یہ کہتا ہے کہ

"اپنی تاریخ دوبارہ رقم کروا اپنے نقطۂ نظر سے"[۲]

تو دراصل علامتی سطح پر یہ ذات کا اثبات اور شناخت کے عمل کا قضیہ ہے یہ شناختی بیانیہ کے نظریے کی رو سے صرف ایک انسان کی ذاتی تلاش کی جدوجہد نہیں بلکہ یہ پوری نسل کی شناختی تلاش کا عمل ہے۔ یہاں شناخت کی اہمیت دوسرے معاملات سے منفرد ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ ناول نو آبادیاتی عہد میں ارذل نسلوں کو اپنی تاریخ دوبارہ لکھنے کی طرف اکساتا ہے۔ اپنی تاریخی حقیقت کو پہچاننے اور اسے کھنگال کر دوبارہ لکھنے اور اپنی شناخت کی تلاش اس ناول کا اہم نکتہ ہے۔ طبقاتی کش مکش اور ارذل نسلوں سے تعلق رکھنے والوں کی کوشش جو وہ برتر نسلوں سے تعلق استوار رکھنے کے لیے کرتے ہیں یہ برتر اور کم تر نسل کا وہ بیانیہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ارذل نسلیں اپنی شناخت حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرتی ہیں۔ ارذل نسلیں اس وقت دوسری نسلوں میں مدغم ہو جاتی ہیں جب نو آبادیاتی عہد میں ایک برتر نسل ان علاقوں کی تمام نسلوں پر قبضہ کر لیتی ہے اور خود کو برتر ثابت کرتی ہے۔ زہرا کہتی ہے۔

> تم تینوں اپنی اپنی جگہ ۔۔۔ اپنی اپنی مردانگی میں سمجھتے ہو کہ میرے لیے کافی ہو مگر میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم تینوں کی مثال کسی مشترک وجود سے ہے جو کہیں بھی نہیں ہے۔[۳]

غلام باغ کے مرکزی چاروں کردار کبیر ناصر، ہاف مین اور زہرا شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کبیر لکھاری ہے اس کے لفظ اس کی شناخت کی تلاش میں نظر آتے ہیں وہ کبھی اپنے حقیقی نام سے نہیں لکھتا۔ قلمی نام ہی

اس کی شناخت ہے۔ کبیر کا کردار شناخت اور عدم شناخت کے درمیان جھولتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی بات دہراتا ہے کہ اپنی زندگی کی بہترین کہانی اس نے ابھی لکھی نہیں اور جب کبھی وہ یہ کہانی لکھے گا اپنے اصلی نام سے لکھے گا۔ کبیر بیک وقت کئی کرداروں کے روپ میں زندہ ہے کبھی فلسفی، کبھی مفکر اور کبھی نظریہ باز کے روپ میں۔ مگر کبیر کی اپنی شناخت گم ہے اس شناخت کی تلاش ہی دراصل کبیر اور زہرا کو ایک دوسرے کے قریب کرتی ہے۔

زہرا اس ناول کا باغی کردار ہے جو کافی مضبوط تخلیق کیا گیا ہے۔ زہرا اپنی شناخت کی تلاش میں انعام گڑھ بھی جاتی ہے۔ وہ مسلسل اپنے اور اپنے باپ دادا یعنی خاندان کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ تلاش کا یہ عمل لامتناہی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ شناختی بحران کے جس عمل سے زہرا گزرتی ہے عصری صورت حال میں زیادہ تر انسان اس شناختی بحران میں مبتلا ہیں۔ بہت سی ذاتیں جو زہرہ جیسے خاندانوں کی ہیں وہ محض احساس برتری یا سماج میں بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے اپنی شناخت خود مٹا دیتی ہیں۔ جیسے زہرہ کا باپ اپنی شناخت ختم کر دیتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے شناختی بیانیہ کو سمجھنے میں معاونت مل سکتی ہے۔

"خس و خاشاک زمانے" میں مستنصر حسین تارڑ نے شباہت جیسا جاندار کردار تخلیق کیا ایک ایسی عورت کا کردار، جو عام ہو کر بھی خاص ہے جس کے اندر ہر وقت پارہ بھرا رہتا ہے اور وہ اپنی معدوم ہوتی ہوئی شناخت کی کھوج میں رہتی ہے۔ شباہت اس عصر کے ان لوگوں میں شمار کی جا سکتی ہے جو اپنی شناخت کی تلاش میں عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متحرک اور تیز ہیں۔ وہ اپنی جڑوں کی تلاش کے لیے کینیڈا سے پاکستان آتی ہے اور اپنی شناخت کو اپنے دادا کے حوالے سے پہچانتی ہے۔ وہ اپنی سانسی نسل سے پیار کرتی ہے اور اپنے دادا سے اپنے بچپن کے قصے سنتی ہے۔ جس کے اندر سانسی لوگوں کی طرح درندوں سے آگاہ تھی۔

> واؤ۔۔۔ "وہ جو ابھی حنوط شدہ حالت میں تھی۔ ان ریچھوں کے نظر آجانے کے سرور میں زندگی سے ابلتی تھی۔ کیا وہ پیارے نہیں ہیں۔ میں انھیں آغوش میں لے کر انھیں چوم سکتی ہوں ۔۔۔ کچا چبا سکتی ہوں۔۔۔۔ اس میں کچھ فتور تو بہر حال تھا۔"

وہ ایک ایسی نڈر عورت ہے جنگل کی تنہائی میں ریچھوں کو سونگھنے والی، ان کی موجودگی سے باخبر، انھیں تاریکی میں بھی دیکھ سکنے والی، ان کی جنس پہچان لینے والی ہے۔ شاید اسی لیے یہ اپنی شناخت کی تلاش میں بہت متحرک ہے۔ دراصل شباہت اپنے اندر اپنی نسل کے جینز رکھتی ہے۔ ان جینز کی بدولت وہ کینیڈا میں رہنے کے باوجود اپنے آباواجداد کی طرح چالاک، ہوشیار اور جانوروں کو پہچاننے والی ہے۔ شناختی بیانیہ کا نظریہ ایسے لوگوں کے بارے میں محتاط رائے دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے اندر اپنے خاندان کی مجموعی خصوصیات کا زیادہ تر

حصہ رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر اپنی شناختی اہمیت کو جاننے کے بارے میں زیادہ تحرک پایا جاتا ہے۔شباہت بالکل ایسا ہی کردار ہے وہ رشتوں میں اپنے دادا سرو سانسی کی طرح ہے۔جو مردار کھاتا ہے۔اور جب وہ انعام اللہ سے ملتی ہے تو اس کی جانب جنسی رغبت رکھتی ہے اور ایک طوائف کی طرح اس کے آگے پیچھے پھرتی ہے وہ اس کی خوشبو سونگھتی پھرتی ہے۔جب ہی وہ اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہے۔

میں تمھاری بیٹی ہر گز نہیں ہو سکتی۔۔میں ایک عورت ہوں۔

وہ اسے کچا چبا سکتی تھی۔[۵]

شباہت روایتی مشرقی لڑکیوں کی طرح اپنے آپ کو مردوں کے اختلاط سے تو بچا کر رکھتی تھی کہ اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کرنا اس نے اپنی بنگالی ماں سے سیکھا تھا لیکن وہ ابھی اتنی بھی مشرقی نہیں ہوئی تھی کہ مشرق کے سب رسم و رواج کو اپنا لیتی اس لیے وہ اپنی شادی کے آئے لوازمات سے مہندی کو اپنی ہتھیلیوں پر لگانا برا سمجھتی ہے اور اس مہندی کو صرف اپنے جسم پر منقش ہاتھی پر لگاتی ہے۔اپنی شادی کی تقریب سے بھاگنے والی شباہت، پانیوں سے خوف کھانے والی شباہت اپنے اندر اتنی بھرپور اور توانا ہے کہ اس نے ناول کے نسوانی کرداروں میں اپنی الگ شناخت مستحکم کی ہے۔

ناول حسن کی صورت حال۔ خالی ۔جگہیں ۔پر۔ کرو میں کردار نگاری کے بہت سے تجربات کیے گئے ہیں جن میں سے ایک تجربہ ہم نامی کا ہے۔ناول میں کم و بیش 6 مختلف عورتیں انیلا بلال کے طور پر سامنے آتی ہیں۔یہ کوئی ایک انیلا بلال نہیں بلکہ معاشرے کی کئی انیلا بلال اس ناول کے ذریعے سامنے آتی ہیں مثلاً سب سے اہم کردار انیلا بلال (رائیٹر کم ایکٹرس) کا ہے۔

انیلا بلال: اے ایس پی سعید کمال کی منکوحہ ہے جس کا کردار منتشر ہے۔جو کٹی ہوئی انگوٹھی کے راز فاش ہونے کے بعد کئی ممکنہ امکانات میں ظاہر ہوتی ہے۔

انیلا بلال: زونل منیجر سعید کمال کی منگیتر ہے۔

انیلا بلال: لکی سٹار کی سسی ہے۔جو اپنا کردار نبھانا بخوبی جانتی ہے۔

انیلا پری: چاہ پریاں والے اساطیری کہانی کا کردار ہے۔

فلم شمع اور شمامہ میں شمامہ کی سہیلی: ایک فلمی کردار جس کا بھائی سیفی شمع کو اغوا کر لیتا ہے۔

یہ تمام انیلا کے کردار مجموعی طور پر معاشرے کی مختلف عورتوں کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔آج تک عورت کی انفرادیت بیان کرنے والوں نے مجموعی طور پر عورت کو نہیں دیکھا تھا اس ناول میں مجموعی انداز میں

عورت کو اور اس کے متعلقات کو دیکھا گیا ہے۔ عورت کی شناخت اس کے نام سے نہیں اس کے کام سے کرائی گئی ہے۔ جو مستقبل میں عورت کی معدوم ہوتی شناخت کا اظہار یہ بن جاتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی اکیسویں صدی کے اہم ناول نگاروں میں ہیں۔ان کے ناولوں میں ''نالۂ شب گیر''ایک اہم ناول ہے جو دورِ حاضر کی عورتوں کی نفسیات کا بہترین عکاس ہے۔ ذوقی ناول کے انتساب میں لکھتے ہیں:

'ہر اس لڑکی کے نام جو باغی ہے اور اپنی شرطوں پر زندہ رہنا چاہتی ہے'[۶]

ناہید ناز اور صوفیہ مشتاق احمد اس ناول کے دو اہم نسائی کردار ہیں۔ صوفیہ کا کردار معاشرہ کے اس چہرہ کی نقاب کشائی کرتا ہے، جہاں عورت گھر کی باندی ہے۔ بندشوں میں اس کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ خوف کی علامت بن کر رہ گئی ہے وہ اپنی شناخت کھو چکی ہے۔ ناہید ناز کا کردار ایک باغی کردار ہے۔ ایک کردار جس کا جنم تو خوف سے ہوا ہے مگر وہ خوف کا خول اتارتے ہوئے پورے مرد سماج سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ وہ اپنی شناخت تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔

ناہید ایک ایسی عورت کے طور پر ابھرتی ہے جو روایت سے بغاوت کی عمدہ مثال ہے۔ ناہید کی سوچ عورت کے حوالے سے بڑی واضح ہے وہ اکثر و بیشتر یہی سوچتی رہتی ہے کہ صدیوں سے تصویر کائنات سے مردوں نے عورت کے خوبصورت رنگوں کو 'کھرچ' کر صرف استعمال اور استحصال کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد آزادی اور بڑے بڑے فلسفوں پر گفتگو کرنے کے باوجود عورت پر پابندیاں لگاتا ہے گھر کی عورت پہروں، بندشوں اور گھٹن کا شکار کیوں رہتی ہے۔ سینکڑوں، ہزاروں برسوں کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو عورت کا بس ایک ہی چہرہ بار بار سامنے آتا ہے۔ حقارت، نفرت اور جسمانی استحصال کے ساتھ مرد کبھی بھی اسے برابری کا درجہ نہیں دے پایا۔ عورت کو ایک ایسے 'جانور' سے تشبیہ دی جانے لگی جس کا کام مرد کی جسمانی بھوک کو شانت کرنا ہے اور ہزاروں برسوں کی تاریخ میں یہ عورت ہمیشہ سہمی ہوئی اپنا استحصال دیکھتے ہوئے خاموش ہے کبھی نہ کبھی اس بغاوت کی چنگاری کو تو پیدا ہونا ہی تھا جو ناہید کے اندر پیدا ہوئی۔ ناہید کے اندر بغاوت کی چنگاری جب ابھرتی ہے تو وہ اس کا اظہار یوں کرتی ہے۔

''کس نے مارا میری نکہت کو...آپ سب نے مل کر مارا ہے میری نکہت کو'...

'اندر چلو۔'اماں زور سے کھینچ رہی تھیں۔

'بے غیرت...'ابو چاچا کی آواز سنائی پڑی...

اور یہی لمحہ تھا جب اس لفظ نے میرے اندر کی غیرت کو جگا دیا تھا۔

'ہاتھ چھوڑو اماں۔' میں نے زور سے دھکا دے کر اماں سے ہاتھ چھڑا لیا—'بے غیرت...آج کسی نے کچھ کہا تو میں کہہ رہی ہوں اتنا برا ہو گا کہ کبھی نہیں ہوا ہو گا۔بے غیرت...ارے کس نے کہا بے غیرت...اس گھر کے مردوں کو غیرت سے واسطہ بھی ہے... کس غیرت کی باتیں کرتے ہیں یہ لوگ...ارے اس گھر کی لڑکیاں تو پیدا ہوتے ہی ان مردوں کے سائز تک سے واقف ہو جاتی ہیں۔'

'نکہت بے غیرت نہیں ہے۔' میں گلہ پھاڑ کر چیخی تھی۔'آپ لوگ لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلی ہی جوان کر دیتے اور مار دیتے ہیں۔اسے بڑھنے کہاں دیتے ہو۔آپ کی شرافت ان بوسیدہ دیواروں کے ذرے ذرے میں چھپی ہوئی ہے۔'[۷]

ناہید ناز کا کردار عورت کے اختصاص کو ظاہر کرتا ہے۔کہ کس طرح جدید عہد کی عورت اپنے اختصاصی رویے کی وجہ سے معاشرتی گھٹن سے گھبرا کر اپنے لیے انفرادیت کی راہ دیکھ رہی ہے اور وہ مرد سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے اس کا شعور ذات اور اس کی نفسیات اسے مد سے زیادہ طاقت بخشتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ناہید مردوں جیسی حرکتیں کرتی پھرتی ہے۔اور بغاوت کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ناہید کو جب ایک ادارے میں لغت نویسی کا کام ملتا ہے تو وہ لغت میں ان تمام الفاظ کے معنی تک بدل دیتی ہے۔جو خالصتاً عورتوں کی تضحیک سے منسوب ہیں۔

''جیسے آوارہ...اس نے آوارہ کے آگے لکھا...بد چلن مرد۔مردوں کے چال چلن عام طور پر خراب ہوتے ہیں۔

فاحشہ...بدکار مرد...

حرام کار...بدکار مرد...

حرامی...بدذات مرد...

مطعون...بدنام زمانہ مرد...

طوائف...ناچنے گانے والا مرد...

ہجڑا۔۔مردوں کی اعلیٰ قسم

رنڈی۔۔۔۔بازارو مرد

عیاش۔۔۔۔۔یہ بھی مردوں کی صفت ہے۔۔

کلنکنی۔۔۔۔بدذات مرد

حرافہ۔۔۔۔بدکار مرد۔''[۸]

ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورت کی کوئی شناخت نہ ہو اور عورت کو حاشیے پر رکھا جاتا ہو وہاں ناہید ناز جیسی باغی عورت کا پیدا ہونا کوئی بڑی بات نہیں رہتی۔ایسی عورتیں اپنی شناخت کے لیے ہر لمحہ کوشاں رہتی ہیں ہر چند کہ معاشرے کی مقتدر طاقتیں ناہید ناز جیسے کرداروں کو شاید قبول نہ کرتی ہوں مگر مابعد جدید ناولوں کے کردار یہ ثابت کرتے ہیں کہ اب ایسی عورتیں وجود رکھنے لگی ہیں جو کسی بھی وقت بم دھماکے کی طرح پھٹ کر اپنی معاشرتی گھٹن کا اظہار کر سکتی ہیں۔ پھر ان کا دھماکہ معاشرے کے لیے سخت نقصان دہ ہو گا۔مابعد مصنفین نے تانیثی حوالوں سے عورت کو حاکم تسلیم کرنا شروع کیا ہے تب ہی ایسے لازوال کردار تخلیق ہو رہے ہیں جو مسلسل اپنی شناخت کے عمل میں مصروف ہیں۔شناخت کی تلاش کا یہ عمل یورپ میں مقبول تو رہا ہی ہے کہ وہاں خاندانی شناخت دو صدیاں قبل ہی معدوم ہونا شروع ہو گئی تھی مگر اس کے برعکس مشرقی معاشرے میں شناخت کا یہ قضیہ پچھلے چند سالوں میں نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے یہی وجہ ہے کہ اب فکشن لکھنے والے اس طرف تیزی سے متوجہ ہو رہے ہیں اور ایسے کرداروں کو موضوع بنا رہے ہیں۔جو اپنی شناخت کے حوالے سے اضطراب رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ://link.springer.com/book/10.1007/978-1-4419-7988-9
تاریخ ملاحظہ 6 جنوری 2022ء بوقت رات 8 بج کر پینتالیس

۲۔ مرزا اطہر بیگ، غلام باغ، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، 2018، ص 42

۳۔ ایضاً، ص 362

۴۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013، ص 627۔

۵۔ ایضاً، ص 630۔

۶۔ مشرف عالم ذوقی، نالۂ شب گیر، لاہور، صریر پبلی کیشنز، ص 3

۷۔ ایضاً، ص 168

۸۔ ایضاً، ص 260